سامی مذاہب عالم میں روحانیت وسریت کے مشترکات وامتیازات کا تجزیاتی مطالعہ

Similarities and Differences of Spirituality and Mysticism in Divine Religions: An Analytical Study

Dr Muhammad Hussain Azad
Professor and Head, Department of Islamic Studies,
NCBA&E, Lahore (Multan Sub-Campus):
drmhazad56@gmail.com

Saira Batool
PhD Scholar, Department of Islamic Studies,
NCBA&E, Lahore (Multan Sub-Campus):
sairaqmz8@gmail.com

Abstract

Man is a witness to the beautiful creation of Allah Ta'ala. The mysticism of creation and its access to self-righteousness is inherent in its nature. How to determine this goal of enlightenment and how to guide it, one starts thinking with birth. Every person in every nation of the world must look into his heart and think like this because his inner man demands him to do so. Every country of the world, every nation, and every person of every religion must come to such a time that he turns to his real Lord and expresses it in his own language. Such ideas are being expressed in every nation and every religion of every country. Orientalists and critics of Sufism insist that Sufism did not begin during the Prophet's Prophethood, but it had already entered human thought. The first description of Sufism is found in the Upanishads. According to Abu Rehan al-Baruni, such a concern is found in every nation and every religion. The theory of the unity of self is based on this. There is no need for any religion or creed, but every person of every nation can achieve closeness to God through constant remembrance because the basis of the religion of spirituality is obtained by renouncing all worldly and all kinds of worldly relations. In this article, a research evaluation of these beliefs has been taken that all religions of the world have had the theory of Sufism, and the source of Islamic Sufism is also the Sufism of ancient religions or the beginning of Islamic Sufism is the spirit of the Prophet (May Allah Bless and Peace Be Upon Him) from life.

Keywords: Greek Philosophy, Neoplatonism, Hinduism, Buddhism, Greek thought, Sufism, Tassawuf and Mysticism.

تصوف ایک ایسا علم ہے جسے ہر عہد کے انسان نے سیکھا ہے اور اس پر عمل کر کے اپنے اخلاق و اطوار کو سنوارا ہے۔ تصوف اخلاقی زندگی کا ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی ہے۔ تصوف کی تعریف و توجیہ اور اس کی تہذیبی و تمدنی اثر انگیزی پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور آج تک لکھی جا رہی ہیں۔

مذاہب عالم کی مختلف زبانوں میں بکثرت تحریری مواد، تصوف کی مقبولیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ تصوف کی مقبولیت اور اثر انگیزی کے باوجود ہر عہد میں اس کی حیثیت متنازعہ رہی ہے۔ عالمِ اسلام کے جمہور علماء نے تصوف کو اسلام کی روح، اخلاقِ حسنہ کی جان، ایمان کا کمال اور شریعت کی اساس قرار دیا ہے جبکہ مخالفینِ تصوف نے اسے غیر اسلامی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ تصوف کی مخالفت میں اگرچہ کم لکھا گیا ہے لیکن جن علمائِ اسلام نے مخالفت کی ہے وہ اپنے عہد کے متبحر عالمِ دین تھے۔ ان میں ابن جوزی، ابن عقیل اور ابن تیمیہ جیسے علم و عمل کے پہاڑ تھے۔ یہ حضرات خالص اسلامی تصوف کے خلاف نہ تھے بلکہ ان کے نزدیک تصوف قرآن و حدیث سے ماخوذ زہد کلیہ کا نام تھا۔ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی آمیزش کے خلاف تھے۔[1]

مستشرقین نے تصوف کو قدیم مذاہب میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان میں بعض کا خیال ہے کہ تصوف کا ماخذ نو فلاطینیت (Neoplatonism) اور اس کا امام فلاطینوس (Plotinus) ہے۔[2] بعض نے ہندو مت اور بدھ مت کو اس کا منبع و مخرج قرار دیا۔[3] مستشرقین کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے صوفیۂ اسلام کے احوال اور یونانی حکماء کے خیالات میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر نکلسن کا خیال ہے کہ تصوف کا ابوالاباء افلاطون اور باطنیت و روحانیت کا بانی فیثاغورث ہے۔ بالآخر دونوں نظریات فلاطینوس کی ذات میں یکجا ہو گئے۔[4] فلاطینوس نے دونوں نظریات کی ترویج و ترسیخ میں اہم کردار ادا کیا۔ فلاطینوس وہ یونانی فلاسفر ہے جس نے رومی لشکر میں سفر کر کے ایرانی اور ہندی تصوف کا مطالعہ کیا اور اسے افلاطون کے نظریات میں ڈھال کر نو فلاطینی فلسفے کے نام سے متعارف کرایا۔ فلاطینوس کی اس نشأۃ ثانیہ کی وجہ سے اہل یونان نے انھیں نو فلاطینیت اور یونانی فکر کا امام کہنا شروع کر دیا۔[5]

---

1 ابن الجوزی، عبد الرحمن بن علی بن محمد (م ۵۹۷ھ)، **"صفة الصفوة"** (حققہ محمود فاخوری) الطبعة الرابعة دار المعرفة للطباعة والنشر والتوزیع بیروت ۱۹۸۶، ص ۲۲۰:۱

2 ڈی اولیری، **"فلسفہ اسلام"** مترجم مولوی محمد احسان احمد، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۲۲، ص:۱۵۰

3 Titus Bruck Hardt, **An Introduction to Sufi Doctrine,** Lahore P .17

4 R,A Nicholoson (1945) **The Misticism of Islam,** Lahore Reprint1979 P.37

5 https://scholarship.rice.edu/bitstream/hand/MysticismHistoricized.pdf
Brian Ogren,Anna Smith Fine Assistant Professor of Judaic Studies, Department of Religion,Rice University, Houston, TX.P-6

ٹائٹس برک ہارٹ نے کہا کہ عیسائیت کی مانند اس نو فلا طونی فلسفے نے اسلامی تصوف پر بھی اثرات مرتب کیے۔[6] ڈوزی اور فان کریم کے نزدیک تصوف کا مآخذ ویدانت تھا اور کچھ مستشرقین کی رائے میں بدھ مت اس کا سرچشمہ ہے۔[7] غیر مسلم ناقدین کا خیال ہے کہ تصوف کے خیالات کا اظہار اقوام عالم کی ہر زبان اور ہر مذہب میں ہوا ہے کیونکہ ظاہری زندگی کو ترک کر کے باطن کی طرف متوجہ ہونا انسان کی فطرت میں شامل رہا ہے۔ آر اے نکلسن، ویر فورس کلارک اور لوئی میسی نون اس نظریے کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک ہر قوم پر ایک ایسا وقت آتا ہے جس میں وہ تصوف کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس نے تصوف کے خیالات کسی دوسرے مذہب سے اخذ کیے ہوں۔ حالات کے تحت وہ خود بخود اپنے نفس کی اصلاح اور باطن کی صفائی کی طرف رجوع کرتا ہے۔[8]

مستشرقین و ناقدین کا خیال ہے کہ تصوف ظہورِ اسلام سے سینکڑوں برس پہلے انسانی فکر میں جگہ بنا چکا تھا۔ انسانی فکر میں تصوف کی موجودگی کو بعض حضرات نے ہندوؤں کے اپنشدوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کی اور بعض نے یونانی الہٰیات میں تلاش کیا۔ اسلامی تصوف سے انکار کرنے والے مسلم سکالرز نے قرآن و حدیث کی بجائے دوسرے مذاہب میں تلاشنے کی کوشش کی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مؤخر الذکر طبقہ کو اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ جاننے کے لیے ان کی سوچ اور افکار میں کس حد تک صداقت ہے ہم سب سے پہلے یہودی تصوف کا جائزہ لیتے ہیں۔

یہودی تصوف

یہودیت ظواہر پرستی کا مذہب ہے۔ اس مذہب میں باطنیت کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم اس مذہب میں بھی باطنیت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ان کے اطوار اور طریق حیات و عبادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی الہامات و مکاشفات اور پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقی تصوف کا انھیں اس وقت علم ہوا جب انھوں نے سکندریہ میں قائم یونانی فکر کا بنظر عمیق مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں ے اپنے عقائد اور یونانی فکر کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا جس کے بانی فیلو (PHILO) ہے۔[9]

---

[6] **An Introduction to Sufi Doctrine,** P .18

[7] An Introduction to Sufi Doctrine, P .16-19

[8] Edward Jabra Jurji**, Illummation in Islamic Misticism**, Sindh Saghar Academy Lahorep-1

[9] پرویز، غلام احمد، **"تصوف کی حقیقت"** مطبوعہ النور پرنٹرز ملتان روڈ لاہور ۱۹۹۲ ص:۲۶

فیلو Philo پہلا یہودی مفکر ہے جو ایک صوفی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ Leacy of Isreel اسرائیل کے مقالہ یونانی یہودیت کے مصنف نے یہودی ازم میں صوفیانہ نظریات و تجربات کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ فیلو اس معاملے میں یہودی نہیں بلکہ یونانی ہے۔[10]

ممکن ہے ورثۂ اسرائیل کے مقالہ نگار کا مؤقف درست نہ ہو کیونکہ ہر الہامی مذہب تزکیۂ نفس اور تصفیہ اخلاق کی بات ضرور کرتا ہے اور یہی بات فیلو نے کی ہے کہ عہد نامہ عتیق بھی فیلو کے مؤقف کی تائید کرتا ہے کہ مذہب کی حقیقی روح اور اس کا مغز داخلی تجربات اور صوفیانہ واردات میں پوشیدہ ہے۔ ایک مذہبی انسان کی زندگی کا بہترین نمونہ یہ ہے کہ" وہ اپنے اعمال و افعال کو رضائے الٰہی کے مطابق ڈھال کر اس کی خوشنودی حاصل کرے"۔ یہودی مذہب میں یہ تصور خالصتاً صوفیانہ ہے جس میں ایک انسان کا اوڑھنا بچھونا اور مقصودِ زندگی فقط رضائے الٰہی کا حصول اور خالقِ کائنات تک رسائی ہوتا ہے۔[11]

فیلو نے اپنے نظریات کا آغاز سکندریہ سے کیا۔ اس نے مذہب کو فلسفہ و حکمت کی روشنی میں پڑھا اور دونوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ مذہبی عقائد اور فلسفیانہ افکارات و مسائل میں تطبیق پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ زرتشی افکار اور رواقی فلسفے سے بھرپور استفادہ کیا۔ رواقیوں کے نزدیک ہر انسان کا قلب اور نفس اس کا بہترین رہنما ہے۔ انسان کو اعمال و افعال کے لیے خارجی ذرائع سے مدد لینے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا اپنا ضمیر، اس کے نفس کا اطمینان اور اس کے قلب کی تصدیق کافی ہے۔ اس کی ذات اخلاق کا مجسمہ ہے۔ انسان بنیادی طور پر ہر دوسرے انسان سے ہم آہنگ ہے اور یہی انسانیت کا خاصہ ہے کہ آقا اور غلام دونوں برابر ہیں مساوات کا یہ تصور رواقیوں نے زرتشتوں اور اسرائیلیوں سے لیا اور رواقیوں کے ذریعے یونانی فکر میں داخل ہونا۔ اس مساویانہ فکر نے مشرق و مغرب اور وحشی و متہذیب کی قدیم جاری تفریق کو مٹا دیا۔ مساوات کا یہ تصور در حقیقت اسرائیلی انبیاء کا عطا کردہ ہے جو رواقیوں کے فلسفے میں نمایاں نظر آتا ہے۔ جلاوطنی کے بعد یہودی قوم جب منتشر ہوئی تو اسرائیلی انبیاء نے مذہب کا عالمگیر نظریہ پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہودی قوم جو جلاوطنی سے پہلے اپنے آپ کو خدا کی چہیتی قوم کہتی تھی۔ آفسہ توحید کی علمبردار بن گئی۔ سیاسی تباہی کے بعد ان کی زندگی میں روحانی جذبات نے لینا شروع کر دی اور وہ اپنے روحانی ارتقاء کی طرف ہونے لگے۔ انہوں نے عملی زندگی کو اختیار کرنے کی بجائے اپنا مستقل روحانی زندگی سے داشتہ کر لیا۔

---

[10] ڈاکٹر ایڈون آربیون (Edwyn)، **"ورثہ اسرائیل"**، آکسفورڈ پریس ۱۹۴۸ء، ص:۴۷

[11] **"ورثہ اسرائیل"**، ص:۴۷

ان کی تمام تر سر گرمیاں کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ پس ان کا نقطہ نظر یہ بن گیا کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے خالق کی حقیقت کو پا لیا۔ حکمت و فلسفہ کی یہ دو مختلف صورتیں فیلو کی سوچ کا مرکز و محور بن کر رہ گئیں۔ اس نے یہودی نظریات کو یونانی فلسفہ کی زبان دے کر ایک نیا تصور دیا جسے مستشرقین نے کلمہ (Loges) کا نام دیا ہے۔ جس کی بازگشت کو آج کے تصوف میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ مستشرقین اسلامی تصوف میں بھی اس کی موجودگی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لوگوں میں کلمہ کا تصور سب سے پہلے ، ہیر اقلیتوس(۵۰۰ق م) (Heraclitus) کے ہاں ملتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقت ازلی ہے جو ہر زمانے اور ہر جگہ صحیح اور درست ہے۔ وہ اس صداقت یعنی کلمہ کو حق کا نام دیتا ہے اور اس کی بھرپور تبلیغ کرتا ہے (کوان فورڈ، یونانی مذہبی افکار، ص۷۹،۷۸ یونانی فکر کی تاریخ میں ، ہیر اقلیتوس پہلا شخص تھا جس نے سقراط اور افلاطون سے پہلے صوفیانہ نظریات اور مذہبی رجحانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔[12]

یونانی کلمہ (Loges) رواقیوں کے واسطے سے یہودیوں میں داخل ہو کر یہودی کلمہ اللہ سے وابستہ ہو گیا۔ رورقیوں کا خیال ہے کہ الفاظ اور تصورات اس فی حقیقت کے دو پہلو تھے اور اسی لیےLoges یا کلمہ جب تک قلب یا ذہن میں رہتا ہے تصور کہلاتا ہے اور جب زبان سے ہوتا ہے تو لفظ بن جاتا ہے۔ یہ کلمہ واحد مرنے کے باوجود تمام انسانوں میں مشترک ہے۔ اور اسی بنا پر انسانیت کو وحدانی تصور عطا کرتا ہے۔[13]

رواقیوں کے ہاں کلمہ یعنی (Loges) کو خدا مانا جاتا ہے لوگ اس (کلمہ) کو عقل کا نام میں دیتے ہیں گویا وہ عقل کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن بعض رواقی مفکرین کلمہ اور عقل کو دو مختلف وجود تسلیم کرتے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں کلمہ کا تصور سامی قوم سیم اور بابل سے لیا۔ ہر کیلٹس کے کلمہ اور بابلی کلمہ میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ آرامی زبان میں کلمہ میمرا (Memra) کہلاتا ہے۔ اس کا مادہ امر ہے جس کے معنی بولنا کے ہیں۔ اسی لیے لوگوس کی میمرا کے معنی کلمہ کے ہیں مگر اس میں عقل کا مفہوم موجود نہیں۔ فیلو نے جب یہودی نظریات کو یونانی فلسفہ کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی تو اس کے سامنے اس قسم کے تمام نظریات و افکار موجود تھے۔ اس نے تمام تصورات و خیالات کو ایک کر کے پیش کیا۔ مذہب و فلسفہ اور عقل و نقل میں تطبیق کی یہ پہلی کوشش تھی جس نے آگے چل کر

---

[12] "**انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاقیات**"، ۸:۱۳۴

[13] بشیر احمد ڈار(م۱۹۷۹ئ) "**تاریخ تصوف**"، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور پاکستان ۱۹۶۲، ص۸۷

عیسائی راہبوں اور مسلمانوں صوفیاء کو بہت متاثر کیا۔ تطبیق کی اس اثر انگیزی کو مستشرقین کے نزدیک منصور بن حلاج، رومی و غزالی، ابن عربی اور عبد الکریم الجیلی کی ذات میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔[14]

فیلو (Phelo) نے اپنے نظریات کی بنیاد اگرچہ افلاطون کے نظریۂ اعیان پر رکھی تاہم فیلو کا مؤقف یہ تھا کہ اعیان کے معروضی وجود کا نظریہ محض افلاطونی فکر سے مخصوص نہیں بلکہ یہ اسرائیلی انبیاء کی مذہبی روایات کا جزو ہے۔ افلاطونی نظریۂ اعیان، فیلو، ارسطو اور رواقیوں کے نزدیک تضاد کا مجموعہ ہے۔ یہودی تصوف کا موضوع تختِ خداوندی یا عرش خداوندی ہے جس کا ذکر عہدِ عتیق کے صحیفوں میں ملتا ہے۔ یہودی اسے عرشی تصوف بھی کہتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے صوفیاء جہاں ذاتِ حق کے مشاہدے کے لیے کوشاں رہے وہاں یہودی صوفیاء نے اپنی تمام کوششیں خدائی عرش کے جلال کے مشاہدہ میں صرف کر دیں۔ ان کے کشف و الہام داخلی تجربات عرشِ خداوندی کی حقیقت و ماہیت جاننے تک محدود رہتے جو، ان کے نزدیک تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ آدم کے بھید کا حامل ہے۔ دوسرے صوفیاء کی طرح انھوں نے بھی حلقے اور سلسلے قائم کیے اور اپنے صوفیانہ اطوار کو اپنے مخصوص لوگوں تک محدود رکھا کیونکہ اخفائے راز تصوف کی اہم کڑی ہے۔ صوفی اپنے حال، ذاتی تجربات و مشاہدات کو ہر حالت میں مخفی رکھتا ہے۔ یہودی صوفیاء کے ان حلقوں میں داخلہ صرف ان لوگوں کو ملتا، جو پاکیزہ اخلاق کے ساتھ علم قیافہ اور علم دست شناسی کے بھی ماہرین ہوتے جو ان شرائط کا حامل ہوتا وہ یہودی صوفیاء کے حلقوں میں داخل ہو جاتا اور پھر اسے مختلف مجاہدات ریاضت اور زہد و عبادت سے گزار کر سلوک کی منازل طے کرائی جاتیں۔ یہ دورانیہ بارہ دن یا عموماً چالیس دن پر مشتمل ہوتا۔ دن کو روزہ رکھنا اور خلوت میں شب و روز گزارنا ضروری سمجھا جاتا جب ان تمام مراحل کو طے کر لیتا تو سمجھا جاتا کہ وہ مشاہدہ عرشِ الٰہی کا حامل ہو گیا ہے۔ عرفانیوں کی طرح یہودی صوفیاء میں بھی خفیہ علم اور اسم اعظم کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسانی روح سیارروں کے محافظ فرشتوں سے بچ بچا کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ منزل، نورِ خداوندی کا دیدار ہے۔ یہودی صوفیاء نے خدا کا تصور اپنے زمانے کے مطلق العنان حکمرانوں کی مثال پر قائم کیا جبکہ دوسرے مذاہب کے صوفیاء میں خدا کا تصور تنزیہی کے بجائے تشبیہی ملتا ہے جو دنیا کے ہر ذرّے میں موجود ہے یہودی تصوف میں اس تشبیہی نظریہ کو سکینہ کے نام سے پکارا جاتا ہے سکینہ کی اصطلاح بعد از اسلام کی پیداوار ہے قبل از اسلام کا یہودی تصوف اس اصطلاح سے یکسر خالی نظر آتا ہے۔[15]

---

[14] "تاریخ تصوف"، ص ۹۳

[15] (انسائیکلوپیڈیا مذاہب مضمون (Gnosticism

اقوامِ عالم کے متصوفانہ نظریات میں وصالِ حق کا تصور یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ وصالِ حق کا یہ نظریہ وجودی صوفیاء میں نمایاں نظر آتا ہے اس کے برعکس یہودی صوفیاء میں ذوق و شوق تو نظر آتا ہے لیکن خدا کی ذات سے محبت اور اس کی ذات میں مدغم ہونے کا جذبہ بالکل نظر نہیں آتا۔ قبل از اسلام کا یہودی تصوف اس جذبے سے یکسر خالی نظر آتا ہے۔ یہودی صوفی فقط عرشِ عظیم کے مشاہدے تک محدود رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی صوفی عبادت و ریاضت اور مجاہدہ و مشقت کے بعد ارواحِ مختلفہ کی مدد سے عملیات اور تصرفاتِ غیبی کی طرف راجع ہو گیا۔ ان صوفیاء نے بعض مناجات تحریر کیں۔ مناجات کے لفظوں کا اتار چڑھائو اور لفظوں کے تکرار پر توجہ دی۔ ان کے نزدیک ان مناجات کے الفاظ کو بار بار پڑھنے سے ایک قسم کا سحر پیدا ہوتا ہے جس سے وہ بیرونی دنیا سے بے خبر رہ کر اپنے اندر جذب کی کیفیت پیدا کر لیتا ہے۔ قدوس، قدوس کی مسلسل تسبیح سے وہ اپنے اندر نفسیانی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس تسبیح سے وہ عملیات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ عامل مرکبہ صوفی کہلاتے ہیں۔ ان کی عملیات اور مناجات پر مبنی ایک کتاب کا ذکر ملتا ہے جس کا نام "پیمائش جسم" یعنی جسم خداوندی ہے ان تزکیہ صوفیاء کے نظریات و عقائد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجسیم کے قائل تھے۔ یونانی، مصری اور عرقانی تصوف میں "باپ کا جسم" کی اصطلاح پائی جاتی تھی۔ یہودی صوفیاء نے خالقِ حقیقی کو تجسیمی لباس پہنا کر عرشِ عظیم پر متمکن کر کے نظریۂ رویت خداوندی اور یہ کہ انسانی آنکھ خدا کو نہیں دیکھ سکتی، اس میں ہم آہنگی پیدا کر دی۔ اس نظریہ ہم آہنگی سے تصور وجود میں آیا کہ عرشِ عظیم پر جلوہ افروز خدا کو آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ لیکن وہ اپنی حقیقی ماورائیت کے لحاظ سے انسانی عقل و حواس سے پرے ہے۔ یہودی صوفیاء کا نظریۂ حیات رہبانہ ثنویت پر مبنی تھا۔ جس کے مطابق یہ دنیا اور اس کی لاشے شر انگیز اور روحانیت کے منافی ہے۔ ان صوفیاء کی تمام تر توجہ فلسفیانہ افکار اور مابعد الطبعیاتی سوالات کرنے کی بجائے، مشاہدۂ عرش کے بیانات تک محدود تھی۔ چنانچہ تیسری صدی عیسوی میں بابل کے ایک مشہور صوفی کا قول بطور مثال پیش کیا جاتا ہے کہ سات صفات ہیں جن سے یہ کائنات تخلیق ہوئی: "حکمت، علم، قوت، عدل، حق، عشق اور رحم۔" انہیں سات صفات کو ایک اور بیان میں متمثل شکل دے کر یوں پیش کیا گیا کہ سات صفات عرش عظمت کے سامنے دست بستہ حاضر ہیں۔ حکمت، حق، عدل، عشق، رحم، سچائی اور امن ہے۔[16]

---

[16] "تاریخ تصوف"، ص:۱۱۰

تصوف کے اس دور میں ایک طرف حروف اور اس میں پوشیدہ پر اسرار قوت اور دوسری طرف جادو اور عملیات کے پہلوئوں پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔ ان صوفیاء کے نزدیک پہلے دس اعداد، عبرانی زبان کے ۲۲ حروف عجیب و غریب خصوصیت کے حامل تھے۔ ان اعداد کے ملاپ سے اس کائنات میں مختلف قوتیں اور مظاہر پیدا ہوئے۔ یہی وہ حکمت کے ۳۲ خفیہ ذرائع ہیں جن کی مدد سے خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ حروف کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ خدا نے انہیں لکھا۔ انہیں کاٹا، ملایا، پھر انہیں تولا، ایک دوسرے سے تبدیل کیا اور پھر ان سے تمام مخلوق کو پیدا کیا۔ وہ مخلوق جو اب موجود ہے اور وہ بھی جسے ابھی پیدا کرنا مقصود ہے۔ عالم انسان، عالم افلاک اور عالم زمان، تینوں عوالم کے ہر حرف میں باطنی مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ایک جاندار عرش کو اٹھائے ہوئے ہے وہ جاندار در حقیقت یہی حروف و اعداد ہیں جنھوں نے زندگی کا لباس اوڑھ لیا ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس سے اسمِ اعظم کا تصور ابھرا ہے۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کا ایک خفیہ نام ہے جس کی تاثیر میں جادو ہے۔ اس عہد کے صوفیاء ایسا چغہ پہنتے جس کے تانے بانے میں اسمِ اعظم شامل برتا۔ ایسا چوغہ صوفیاء کے لیے باعثِ اعزاز ہونے کے ساتھ ان کی شناخت بھی سمجھا جاتا۔[17]

ان مرکبہ صوفیاء میں اخلاقی تعلیم مفقود تھی۔ ان کو عرشِ خداوندی اور اس تک رسائی کے علاوہ کسی اور شے سے سروکار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے تصوف کا کردارِ تعمیر اخلاق میں یکسر ناپید نظر آتا ہے۔ ان صوفیاء کی تعلیمات میں ذاتی مشاہدات و تجربات اور مراقبات و ریاضات کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یہودی فکر، اخلاقی تصوف سے یکسر ناآشنا نظر آتی ہے جو کہ در حقیقت تصوف کی جان اور شان ہے۔

متذکرہ بالا یہودی تصوف کے مطالعہ کے بعد ہر بات سامنے آگئی ہے کہ علمِ باطن، اسم اعظم، علمِ اعداد، نورِ خداوندی کا دیدار جیسے نظریات پائے جاتے تھے۔ یہودی صوفیاء کا مخاطب انسان نہیں بلکہ ان کے خیالات کا مرکز و محور روحانی ارتقاء ہے۔ یہودی تصوف میں ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ عالمِ مقعولات یہودی مفکر فیلو کی ایجاد ہے۔ یہودی صوفیاء نے عروج کی بجائے تنزل کی اصطلاح کو استعمال کیا۔ ان کے نزدیک بلند ترین منزل وہ ہے جب ایک صوفی عرش خداوندی کی طرف نزول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے صوفیاء کو صوفیائے نزولیین بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صوفیاء چوتھی پانچویں صدی عیسوی میں فلسطین میں موجود تھے۔ علم دست شناسی کے موجد بھی یہی صوفیاء نظر آتے ہیں۔

---

[17] "تاریخ تصوف"، ص:111

عیسائی تصوف

عیسائیت کے ابتدائی دور میں تصوف عروج پر تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی کا جو نقشہ بائبل نے کھینچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں صوفیاء کی تمام تر صفات پائی جاتی تھیں۔ وہ کشف و کرامات اور مشاہدات و تعلق باللہ کی نعمت عظمیٰ سے متصف تھے تاہم ان کے مشاہدات و تجربات انفعالی نہ تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک مشہور قول ہے کہ "آسمانی بادشاہت تمھارے اپنے اندر ہے اور جو کوئی اپنے نفس کو پہچان لیتا ہے وہ اسے پالیتا ہے۔ صوفیہ میں بھی یہ مشہور ہے کہ جو اپنے نفس کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے۔ یوحنا کی انجیل فکرِ تصوّف سے مالا مال ہے۔ کلیمنٹ (Clement) اس انجیل کو روحانی انجیل کہا کرتا تھا۔ بعد کے عیسائی صوفیاء نے یوحنا کے تصورات کو ہی پایا ہے۔ ڈاکٹر جونس کے نزدیک یوحنا رسول نے صوفیانہ افکار کی تشریح وترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بعد کے صوفیاء نے یوحنا کے اسی مسلکِ تصوّف سے استفادہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یوحنا نے جس تصورِ عیسائیت کی تبلیغ کی وہ در حقیقت ایک انسان کے داخلی تجربات و اردات پر منتہی ہے اور یہی تصوف کی بہترین تشریح ہے۔[18]

یوحنا رسول کے مطابق "خدا محبت" ہے "خدا نور ہے" اور خدا روح ہے۔ انجیل کے ان فقروں میں مذاہبِ عالم کا پورا تصوف مضمر نظر آتا ہے۔ حقیقتِ مطلقہ، انسانی عقل کے ادراک سے ماوریٰ ہے۔ تصوف میں سلوک کی آخری منزل اتحاد ہے جہاں ایک سالک محسوس کرتا ہے کہ وہ خالقِ کائنات کی ذات وصفات میں مدغم ہو چکا ہے۔ اتحاد کا یہ تصور یوحنا کی انجیل میں موجود ہے۔ کلمہ (olges) کے متعلق جو تصور فیلو کا ہے وہی یوحنا انجیل کا ہے۔ یوحنا کی انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسی صفات کے حامل تھے جو کہ ایک عام انسان میں موجود نہیں ہوتیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کو ازلی اور عالم الغیب سمجھتے تھے۔[19]

تصوف کی اصطلاح میں وسیلہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے جیسا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان امتیاز کو وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح انبیاء کے ساتھ محبت کو خدا کے ساتھ محبت قرار دیا گیا ہے۔ محبت کا یہی تصور عیسائی تصوف اور اسلامی تصوف میں پایا جاتا ہے۔ پولوس کو عیسائی تصوف میں خاص اہمیت دی جاتی ہے، اگرچہ پولوس یہودی تھا اور کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اور ان کے متعلق پولوس کے

Illummation in Islamic Misticism .p-1

EncyclopaediaBritianica London 1955 16:51[19]

افکار عیسائیت کی بجائے یونانیت سے ماخوذ تھے، ان کے خیالات میں یوحنا کی تعلیمات کی بجائے صوفیانہ افکار کی آمیزش تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق وہی قدیم لوگوں میں (Logoes) کا تصور جو زرتشتی مذہب سے یونانی فکر میں داخل ہوا اور وہ ہیراقلیتوس اور افلاطون سے ہوتا ہوا فیلو، یوحنا اور پولوس میں استقرار پذیر ہوا۔ فیلو کے ہاں لوگوس (Logoes) کا تصور مسیح کے بغیر تھا جبکہ پولوس اور یوحنا میں یہی کلمہ مسیح کا روپ دھار لیتا ہے۔[20]

عیسائی تصوف کی دوسری شخصیت اگسٹائن ہے جو کہ شمالی افریقہ کے ایک شہر ٹاگسٹ میں ۳۵۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز بطور معلم کیا اوراعترافات کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اس زمانے کی مذہبی زندگی کا مکمل نقشہ پیش کرتی ہے۔ آگسٹائن سسرو سے وہ بہت متاثر تھا۔ اس نے مانوی مذہب اور عیسایت کا گہرا مطالعہ کیا۔ دونوں کے تقابل نے اس کے خیالات میں ایک اضطراب پیدا کر دیا۔ ابتلاء کے اس دور میں فلاطینوس اور دیگر نو فلاطونی فلاسفہ کی کتابیں مطالعہ کو ملیں۔ ان کتابوں میں مانویت کی ثنویت کی بجائے وحدانیت کا تصور پڑھنے کو ملا۔ وہ ان کتابوں سے بہت متاثر ہوا کیونکہ یہ عیسائیت کے زیادہ قریب تھیں۔ آگسٹائن نے نفسانی خواہشات کو ترک کر کے پولوس کی تعلیمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ آگسٹائن کی زندگی کا زیادہ تر حصہ مناظروں میں گزرا تاہم متصوفانہ نظریات میں اس نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ ایک طرف شریعت و عقل کا علمبردار تھا اور دوسری طرف وہ طریقت و عشق کا نمائندہ تھا۔ وہ خدا کی ذات کے ساتھ بلاواسطہ ربط پیدا کرنے کی اہلیت کا نہ صرف حامی تھا بلکہ اس کا مبلغ بھی تھا۔ وہ کلیسائی روایات کا پاسدار بھی تھا اور ایک صوفی بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت کی تاریخ میں اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ آگسٹائن مشاہدۂ حق کا حامی ہے۔ عیسائی تصوف میں تصفیۂ قلب، مشاہدۂ نور اور وصال کو اہمیت حاصل ہے۔ آگسٹائن نے تصوف میں چند اصطلاحات بھی متعارف کرائی ہیں۔ اس کے نزدیک روحِ انسانی سات مختلف مراتب سے گزرتی ہے۔ چار درجوں میں اول کا تعلق حیات، حواس، عقل اور اخلاق سے ہے۔ پانچویں درجے میں نفسانی خواہشات کا زور اور پہچان سکون پذیر رہا ہے۔ چھٹے درجے میں مشاہدۂ حق کے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور آخری درجے میں مشاہدۂ حق کا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ آگسٹائن کہتا کہ میں نے سلوک کی ان منازل کو طے کیا ہے۔ سلوک کی منازل میں آگسٹائن نے توجہ علی القلب اور ذکر پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ دل میں اللہ کی یاد کے سوا کسی اور شئے کا گزر نہ ہو تا کہ مشاہدۂ ذاتِ حق میں سرور اور لذت حاصل ہو سکے۔ آگسٹائن اس دنیا میں مشاہدہ ذاتِ

---

[20] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے آرایم جونز، آر اے نکلسن، ڈبلیو آر انج، انڈر ہل، ڈبلیو ای ہاکنگ کے حوالہ جات مع کتب دیے ہیں۔

حق کا قائل ہے اس کا کہنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور پولوس نے اس دنیا میں مشاہدہ کیا۔ اس لیے ہر صالح اور متقی شخص کے لیے اس نعمت عظمیٰ کا حصول ممکن ہے۔[21]

تصوف کے ناقدین نے اسلامی تصوف پر تبصرہ کرتے ہو کہا ہے کہ اسلام کی حیات روحیہ پر جہاں یونانی، ہندی اور ایرانی اثرات پائے جاتے ہیں وہاں نصرانی تصوف نے بھی اثرات مرتب کیے کیونکہ قبل ز اسلام نصرانیوں اور عربوں کا باہمی روابط بہت زیا گہرے تھے اور عیسائی علمی اعتبا سر بہت آگے تھے۔ عرب اپنی علمی کم مائیگی کے سبب نصرانیوں کے محتاج تھے۔ صوفیائے اسلام نے گوشہ نشینی اور ترک دنیا اور رہبانیت جیسے اصول عیسائی راہبوں قسیسیوں اور اسقفوں سے اخذ کیے۔ وان کریمر Von Kremer گولڈ زیہر Gold Ziher پروفیسر نولڈیکی، آسین پلاسیوس، انڈرے ، پروفیسر ڈی اولیر،ٹر منگھم ، پروفیسر ہاکنگ ، مارٹن لنگز، ٹائٹس برک ہارٹ، ولیم سٹو ڈرٹ اور پروفیسر آرائے نکلسن R.A Nickolson سمیت مستشرقین کی اکثریت اسلامی تصوف کو عیسائیت سے ماخوذ قرار دیتی ہے اور ان سب کے نزدیک رہبانیت، گوشہ نشینی، ایثار، صبر و قناعت، فقر و درویشی، تسبیح کا ستعمال، نظام خانقاہیت، ذکر و فکر اور صوفیانہ احوال و مقامات عربوں نے عیسائی راہبوں سے سیکھے۔ وان کریمر کا خیال ہے کہ اسلامی تصوف میں رائج اقوال و خیالات، نظام خانقاہی اور گوشہ نشینی کا تصور عربوں نے عیسائی راہبوں سے لیا۔[22]

اسلامی تصوف

اسلامی تصوف کی اساس شریعت ہے اور اس کا ماخذ قرآ اور حدیث ہے۔ جس تصوف کی شہادت شریعت نہ دے وہ بے دینی کے سوا کچھ نہیں۔ قرونِ اولیٰ کے صوفیہ کے اقوال و افعال اس بات شاہد ہیں کہ تصوف قرآن و حدیث سے مستنبط و مستخرج ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں احسان، ایمان ہی کی ایک ارفع منزل کا نام ہے۔ ایمان اگر پہلا قدم ہے تو احسان اس کا دوسرا قدم، دونوں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور احسان کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی تمام تر جہد مسلسل کو ایک عظیم مقصد کے لیے وقف کر دے۔ اس کی عبادت و ریاضت، نماز روزہ اور قربانی اور اس کا مرنا جینا سب اس کے معبود حقیقی کے لیے ہو۔ اسلامی تصوف میں اس حقیقت کو یؤمنون بالغیب سے تعبیر کرتا ہے۔ حدیثِ جبریل کو اس ضمن میں تصوفِ اسلامی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ جس میں حضرت جبریل علیہ السلام ایمان، اسلام اور اور احسان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ اسلام

---

[21] روفوس جونز: "صوفیانہ مذہب کا مطالعہ" ص:۵

[22] " تاریخ تصوف"، ص:146

ظاہر ہے اور ایمان ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور احسان ظاہر اور باطن دونوں کی حقیقت ہے۔ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اللہ کو نہیں دیکھ رہا تو تو یہ گمان کرے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ احسان کے اس مقام ارفع کو شاہ ولی اللہ دہلوی نے سلوک و تصوف کا نام دیا ہے۔[23]

صوفیہ نے تصوف کو قرآن و حدیث سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ یہاں چند متقدّمین صوفیہ کی وضاحت قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر کی جاتی ہیں :

1۔ سیّد الطائفہ جنید بغدادی (م۲۹۷ھ) نے تصوف کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: تصوف سراسر ادب و اخلاق کا نام ہے۔ ہمارا علم معرفت کتاب و سنت کا پابند ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حدیث سے مضبوط ہوتا ہے۔ اخلاق رذیلہ سے نکلنا اور ہر اچھے اخلاق میں داخل ہونا تصوف ہے۔[24]

2۔ ابو الحسین احمد نوری (م۲۹۵ھ) نے تصوف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: تصوف رسوم لوم کا نام نہیں بلکہ اخلاق کا نام ہے تمام نفسانی خوہشات وک ترک کر دینے کا نام تصوف ہے۔[25]

3۔ ابو بکر الطمستانی (م۳۴۰) نے تصوف کے بارے میں فرمایا: تصوف کی راہ واضح ہے۔ کتاب و سنّت ہمارے درمیان ہے اور صحابہ کی فضیلت ہمیں معلوم ہے اس لیے کہ انھوں نے ہجرت کرنے میں سبقت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی۔ پس ہم میں سے جو بھی کتاب و سنّت کا ساتھ دے، اپنے نفس اور مخلوق سے دور رہے وہی راہ راست پر ہے۔[26]

4۔ ابو القاسم النصر آبادی (م۳۷۲ھ) کے نزدیک تصوف کی اصل کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونا، خواہشات اور بدعات کو ترک کرنا شیوخ طریقت کی حرمتوں کی تعظیم کرنا مخلوق کے عذر دیکھنا اور پھر اس پر مداومت اختیار کرنا، رخصتوں اور تاویلات کے ارتکاب سے بچنا ہے۔[27]

5۔ سید علی ہجویری (م۴۶۵ھ) کے بقول تصوف حق ہے اور اس کا انکار احکام شرعیہ اور جملہ انبیاء کا انکار ہے۔[28]

---

23 دہلوی، شاہ ولی اللہ (م۱۱۷۶ھ) **"الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ"** مطبع احمدی دہلی ۱۳۱۱ھ، ص:۱۷،۱۶

24 امام قشیری، عبد الکریم بن ہوازن (م۴۶۵ھ) **"الرسالۃ القشیریۃ فی علم التصوف"**، ص:۵۵

25 ہجویری، سیّد علی (م۴۶۵ھ) **"کشف المحجوب"** نسخہ سمرقند: ۱۲۲

26 **"الرسالۃ القشیریۃ فی علم التصوف"**، ص:۴۹

27 السلمی، عبد الرحمن محمد بن الحسین (م۴۱۲ھ) **"طبقات الصوفیہ"** تحقیق نور الدین سربیہ، الطبعۃ الثانیہ دار الکتاب النفیس حلب، سوریا ۱۹۷۹، ص:۴۸۸

28 **"کشف المحجوب"** نسخہ تہران، تصوف فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۸۸، ص:۳۳

6۔ امام قشیری (م۴۶۵ھ) نے فرمایا کہ علم شریعت کی دو اقسام ہیں: ایک فقہا و علماء سے مخصوص ہے اور دوسری جو شریعت حقیقت کی تائید سے محروم ہے غیر مقبول ہے اور جو حقیقت شریعت کی قید سے آزاد ہے، بے سود ہے۔[29]

7۔ (سیّدنا شیخ عبد القادر الجیلانی (م۵۶۱ھ) جس حقیقت یا طریقت کی شرع تائید نہ کرے اور اسے جائز نہ ٹھہرائے وہ صریحاً کفر و الحاد ہے۔[30]

8۔ حضرت مجدّد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) کے نزدیک "طریقت اور شریعت ایک دوسرے کا عین ہیں۔ ان کے درمیان بال برابر بھی مخالفت نہیں جو چیز بی شریعت کے کے خلاف ہے، مردود ہے۔"[31]

9۔ امام مالک (م۱۷۹ھ جس نے فقہ حاصل کی اور تصوف حاصل نہ کیا پس اس نے فسق کیا اور جس نے تصوف پایا اور فقہ حاصل نہ کی پس وہ بے دین ہوا اور جس نے ہر دو کو جمع کیا وہ حقیقت میں پختہ ہوا۔[32]

10۔ ابن جوزی نے فرمایا: تصوف ابتداء میں زہد کلیہ کا نام تھا۔[33]

گویا تصوف کا موضوع اور غرض و غایت معرفتِ الٰہی، قربِ خداوندی، تزکیہ نفس اور صفائے قلب کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ حصول قرب اور معرفتِ حق کے لیے بندہ اپنے اخلاق کی اصلاح کرتا ہے۔ باطن کا تزکیہ کرتا ہے۔ معبودِ برحق کی عبادت کرتا ہے۔ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔ مراقبہ و مجاہدہ کرتا ہے۔ توبہ و استغفار، زہد و ورع، صبر و توکل اور تسلیم و رضا کو اپنا کر حقیقتِ مطلقہ تک رسائی حاصل کرنا ہے کیونکہ اس کے نزدیک حصولِ قرب کا یہی ذریعہ ہوتا ہے۔ رضائے الٰہی کے لیے دن کو روزہ رکھنا، رات کو قیام کرنا۔ عمل میں اخلاص پیدا کرتے ہوئے قرب خداوندی کے لیے جدوجہد کرتا۔ رعایتِ اعمال اور کسی رکن کی ادائیگی میں یادِ الٰہی سے غافل نہ ہونا اور فقط اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔ ان حضرات القدس کا شعار ہوتا ہے۔ یہی وہ اعمال و افعال ہیں جنہیں بعد میں مقامات و احوال کا نام دیا گیا ہے۔

تحقیقی مطالعہ

متذکرہ بالا یونانی، یہودی، چینی، ایرانی اور عیسائی تصوف کے تفصیلی مطالعہ سے صریحاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ تصوف اقوامِ عالم کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ حیات و کائنات کے بارے میں

---

[29] "الرسالۃ القشیریۃ فی علم التصوف": ۲:۷

[30] جیلانی، شیخ عبد القادر (م۵۶۱ھ) "الغنیۃ لطالبی طریق الحق"، مکتبہ تراث الاسلام دار الالباب حلبونی دمشق، ص:۴۲۹

[31] "مکتوبات امام ربانی"، مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۸ھ، ص:۹

[32] زروق، ابو العباس احمد بن احمد (م۸۹۹ھ) "قواعد التصوف" صححہ محمد زھری النجار، الطبعۃ الثالثۃ داراحیاء التراث الاسلامی العربی بیروت ۱۹۸۹، ص:۴

[33] ابن الجوزی، جمال الدین عبد الرحمن بن علی بن محمد (م۵۹۷ھ) "تلبیس ابلیس"، مکتبہ المتنبی الجمھوریہ دار الطباعۃ المنیریۃ القاھرۃ ۱۹۸۸، ص:۱۶۱

مختلف نظریات اور طرز احساس کی مانند تصوف بھی ایک مخصوص رویّے کی صورت میں انسانی زندگی کی داخلی کیفیات میں پایا جاتا تھا اور اس کا اظہار وہ اپنے نفسی، روحانی، ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے مطابق کرتا رہتا تھا۔ تصوف کی تعبیر و تشریح میں مستشرقین کا رویّہ ہمیشہ سے متعصبانہ رہا ہے۔ انھوں نے تصوف کو سرّیت (Mysticism) کا مترادف ٹھہرایا ہے اور تصوف کو ذاتی اور نہاں کیفیت خیال کیا ہے۔ اسلامی تصوُّف کو نو افلاطونیت عیسائیت، بدھ مت اور ہندو فلسفے سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے تصوف خالصتاً قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے جبکہ سرّیت کا منبع و مخرج نو فلاطونیت ہے۔

مذکورہ بالا اقتباسات، عیسائی راہبوں اور یہودی پیشواؤں کے روحانی اور باطنی تجربات ہیں، جو مستشرقین کی تصانیف سے لیے گئے ہیں۔ ان اقتباسات میں تصوُّفِ اسلام کی کسی کتاب سے کوئی اقتباس اپنے مؤقف کی تائید میں نہیں لا سکے۔ ان تمام عبارات کا اسلامی تصوُّف سے کوئی تعلق نہیں۔ ان اقتباسات میں ایک طرف لفظ سریّت کو ناقابل فہم اور ناقابل تعریف سمجھا گیا ہے تو دوسری طرف اس کا اعتراف کرتے ہوئے اسے ایک ایسا رویّہ قرار دیا ہے جس کا مقصد اشیاء کی حقیقت غائی کا ادراک حاصل کرنا ہے۔ اس کے ایک پہلو کو فلسفیانہ اور دوسرے کو مذہبی ٹھہرایا گیا ہے اور ذاتِ الٰہی سے اتصال کا براہِ راست ذریعہ جانا ہے۔ پروفیسر ہاکنگ نے اس تضاد کو اپنے اقتباس میں واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ مستشرقین کا یہ نقطہ نظر کہ سرّیت ناقابل فہم ہے، یہ ایک مبہم مذہب ہے یا یہ کہ سرّیت افشائے راز کی پر اسرار کاوش ہے، غلط فہمی پر مبنی ہے'۔[34]

مغرب کے بعض اہلِ قلم تصوُّف میں گہرا مطالعہ رکھنے کے باوجود تعصب کے خول سے باہر نہیں نکل سکے، بعض اوقات تو اسی تعصب کی بنا پر، حقیقت سے چشم پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈی اولیری تصوُّف کو تیسری صدی ہجری کی پیداوار اور یونانی فلسفے کا حصہ سمجھتے ہی۔[35] جبکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ تصوُّف کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں ہو چکا تھا جیسا کہ ابو نصر سراج (م۳۷۸ھ) امام قشیری (۳۷۶۔۴۶۵ھ) شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور ڈاکٹر محمد مصطفی حلمی کی تحریروں سے ثابت ہے۔[36]

---

34 ولیم آرنسٹ ہاکنگ، "**انواع فلسفہ**" مترجم ظفر حسین طبع اوّل، مطبوعہ لکنؤ ۱۹۵۲، ص:۳۰۵

35 ڈی اولیری، "**فلسفہ اسلام**" مترجم مولوی محمد احسان احمد:۱۵۲

36 حلمی، ڈاکٹر، "**تاریخ تصوف اسلام**" مترجم رئیس احمد جعفری، ص:۱۷

مستشرقین کا یہ مؤقف کہ تصوّف یونانی، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور ہندی اثرات کا نتیجہ ہے اور صوفیائے اسلام کی زندگی راہبانہ تھی اور انھوں نے تجرّد کی زندگی کو ترجیح دی، حقیقت پر مبنی نہ ہے۔ دنیا اور متاعِ دنیا کے بارے، صوفیہ کا مسلک سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے عین مطابق تھا۔ اکابر صوفیہ نے شادیاں کیں اور دنیا میں رہتے ہوئے زہد و تقویٰ کو اختیار کیا۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۰ھ) جو کہ سلاسل اولیاء کے امام ہیں، ان کی ایک بیٹی تھی جس کا انتقال ہو گیا تھا، ان کا جنازہ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۰ھ) نے پڑھایا۔[37] مالک بن دینار (م ۱۳۳ھ) حبیب عجمی (م ۱۵۶ھ)، فضیل بن عیاض (م ۱۸۷ھ)، حضرت عبداللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) اور سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) رحمۃ اللہ علیہم اجمعین صاحبِ اہل و عیال تھے۔[38]

سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ (م ۵۶۱ھ) کی چار بیویاں تھیں جن سے ۲۷ بیٹے اور ۲۲ بیٹیاں تھیں۔[39] خواجہ معین الدّین چشتی، خواجہ بختیار کاکی اور خواجہ حمید الدّین ناگوری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین،[40] نے متاہِلانہ زندگیاں بسر کیں۔ سیّد علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> " نکاح تمام مردوں اور عورتوں کیلئے مباح ہے اور ان پر فرض ہے جو حرام سے بچنے کی سکت نہ رکھتا ہو اور ان کیلئے سنت ہے جو اہل و عیال کا حق ادا کرتے ہیں"۔[41]

شیخ ضیاء الدّین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> "صوفیہ کے آداب، تزویج کے بارے میں یہ ہیں کہ دنیا کیلئے شادی نہ کی جائے اور نہ مال دار عورت سے، بلکہ سنت پر عمل کرنے اور غفلت سے بچے رہنے کے لیے کی جائے پھر اپنی طاقت کے موافق بیوی کے ضروری اخراجات کو برداشت کیا جائے"۔[42]

---

37 مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶) **"مقالات احسانی"** مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹، ص:۲۷۲

38 عطار، شیخ فرید الدین (م ۶۲۷ھ) **"تذکرۃ الاولیاء"** مترجم مولانا زبیر افضل عثمانی کراچی ۱۹۷۵، ص:۳۲

39 گیلانی، سیّد محمد امیر شاہ، **"تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ"** باراوّل ناشر عظیم پبلشنگ پشاور، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲، ص:۲۵۸

40 چشتی، شیخ عبد الرحمن (م ۱۰۹۴ھ) **"مرآۃ الاسرار"** مترجم واحد بخش سیال، طبع تعریف پرنٹرز ناشر الفیصل اردو بازار لاہو، ص:۴۰۷

41 ہجویری، سیّد علی (م ۴۶۵ھ) **"کشف المحجوب"** (تحقیق ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی) مطبوعہ سمن سمن پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۵، ص:۵۲۲

42 سہروردی، ضیاء الدین (م ۵۶۳ھ) **"آداب المریدین"** مترجم محمد عبد الباسط مطبوعہ تصوف فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۹۸، ص:۱۱۳

خلاصہ بحث

مقالہ ہذا کے تفصیلی مطالعہ کے بعد صراحت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان روز اوّل سے اپنے خالق حقیقی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرنے کے لیے سوچ بچار کرتا رہا ہے۔ اس کی سوچ اور اظہار کا طریقہ مختلف ہونے کیا باوجود منزل مقصود سب کی ایک ہی رہی ہے۔ ہندی، ویدانتی، چینی، فارسی، یونانی، فارسی، بدھ مت، یہودیت اور نصرانیت جیسے جملہ مذاہب کے پیروکار اپنے خالق حقیقی کے ساتھ ربط رکھنے اور قرب حاصل کرنے کی جانب راغب رہے ہیں لیکن کسی ایک مذہب میں بھی وصال حق کے اس طریق کو تصوف کا نام کسی نے نہیں دیا اور نہ ہی راہ حق کے ان سالکین کو کسی قوم یا مذہب میں صوفی کہا گیا ہے۔ تصوف اور صوفی کی اصطلاح دوسری صدی ہجری میں وجود میں آئی۔ مستشرقین وناقدین تصوف کا یہ دعویٰ بھی درست نہیں کہ صوف پہننے والے کو صوفی کہا گیا ہے۔ صوفیاء اسلام نے انبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے صوف پہنا ہے اور پھر یہ انسان اوّل حضرت آدم اور ان کے پیغمبر بیٹے شیث علیہما السلام سے لے حضرت عیسیٰ علیہم السلام تک سب انبیاء ورسل کا لباس رہا ہے۔ صوفیہ نے بھی سنتِ انبیاء پر عمل کرتے ہوئے صوف زیب تن فرمایا ہے لیکن اسے اپنے اوپر لازم نہیں کیا اور نہ ہی اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ صوف پہننے والا ہی صوفی ہو سکتا ہے۔ ابو نجیب عبد القاہر سہروردی نے واضح الفاظ میں اپنی کتاب آداب المریدین میں فرمایا ہے کہ صوفیہ کو جو لباس میسر آتا وہ زیب تن فرمالیا کرتے تھے۔

مستشرقین بالخصوص نکلسن نے بھی رجوع کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے ہ صوفیہ اسلام نے ذکر وفکر سمیت جملہ صوفیانہ اطوار قرآن سے اخذ کیے تھے اور ان کا تصوف بھی قرآن حدیث سے ماخوذ تھا۔ عیسائیت میں لفظ MISTICISM استعمال ہوہے جو کسی طور تصوف کا مترادف نہیں ہے۔ تصوف کا ترجمہ سرّت کیا گیا ہے۔ سرّیت اور تصوف دو مختلف مصطلحات ہیں۔ تصوف قرآن وحدیث سے اخذ کیا گیا ہے جو اس سے قبل احسان کی صورت میں موجود تھا اور جملہ صحابہ کی زندگیوں میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ گوشہ نشینی کے متعلق بھی مستشرقین کا واویلا غلط ہے۔ صوفیہ اسلام ترک دنیا، رہبانیت اور تجرد کو یکسر ردّ کرتے ہیں کونکہ قرآن اور احادیث میں رہبانیت اختیار کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ تفکر وتدبر کے لیے صوفیہ خلوت نشین ہوتے ہیں ۔ لیکن ضروری دنیاوی امور بجالاتے رہتے ہیں۔ صوفیہ میں خلوت نشینی کا تصور یہ ہے کہ ہاتھ کام میں لگا رہے اور دل یاد الٰہی میں مصروف رہے۔